میرتقی میر کی غزل گوئی

میر اردو شاعری کے وعظیم غزل گو شاعر ہے جن کو حیات جاوید حاصل ہے میراردو غزل کے مسلم الثبوت استاد مانے گئے ہیں ناسخ ذوق مؤمن اور غالب جیسے بلند پایا شعرا میر کی عظمت کے قائل ہیں ذوق نے کیا خوب کہا ہے۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
زوق یاروں نے بہت زور
غزل میں مارا

میں آگرہ کے ایک شریف خاندان کے چشمہ چراغ تھے۔ والدہ ایک صوفی منش بزرگ تھے میر کوانھوں نے ابتداء سے ہی اپنے ڈھنگ پر لگایا ان کو دنیا سے بے نیاز اور عشق مولا میں سر شار رہنے کی تعلیم دی۔

میر کو بچپن سے ہی شعر و سخن کا بے حد وشوق تھا بچپن میں ہی شعر کہنے لگے تھے – میر کی زندگی بڑی بے چارگی اور پریشان حال میں گزری - دس سال کے تھے کے باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔میر نے زندگی بھر غم اٹھا ئے اور پریشان حال رہے والد کا انتقال کے بعد گھر سے نکل پڑے تھے چچا کا بھی انتقال ہو گیا تھا بھا ئ اور ماموں سخت دشمن ہو گۓ -

آگو ہ چھوڑ کر دہلی پہنچے وہاں بھی سیکڑوں اپریشانیوں اور مصائب کا سامنا ناکر نا پڑا۔ دہلی سے لکھنؤ آئے مگر وہاں بھی ان کی خودار طبیعت کو سکون نہیں ملا۔ ان تمام پریشانیوں اور مصیبتوں کا نفسیاتی اثر پڑا۔ ان کو بھی غموں سے فرست نہ ملی –

میر کی شاعری ان کی زندگی کا عکس ہے۔انہوں نے اپنی آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کے پیش کیا۔ وہ زندگی میں سر مستی اور کیف کا ایک گوشہ تلاش کر لیتے ہیں ان کی غزلوں میں انداز بیان اور لہجے نے صرف اپنے دور کے ہی لوگوں کو متاثر نہیں کیا بلکہ اس کا اثر آج کے شعراء پر بھی بہت گہرا پڑا ہے ۔ فانی اسکی بہترین مثال میں میر

کو شق سے عشق تھا ان کے یہاں عشق مجازی کی نمایاں جھلک ہے مگر عشق کو ناکامیوں نے میر کی حالت عجیب کر دی۔

میر کی تجھ سے توقع تھی ستم گر نکلا موسم سمجھے تھے تیرے دل کو سو پھر نکلا

داغ ہوں رشک محبت سے کہ اتنا بیتاب کسی تسکین کے لئے گھر سے باہر نکلا

میر شق میں بے خود ہوکرا تے منتظر نظر آئے ہیں ۔

بے خودی لے گئی کہاں مجھ کو دیر سے انتظار ہے اپنا

میر کے بہترین اشعار وہ ہیں جو ان کے سچے جذبات اور ناکام محبت کے حقیقی ترجمان ہیں زبان نہایت سادہ روانی میں دیکھا

اور محسوس کیا۔ میر عشق کی واردات قلبی بیان کرنے یں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ خارجی اظہار کے بیان میں میر کو کمال حاصل ہے ان کا مشہور شعر اس بات کی دلالت کرتے ہیں۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے

میر ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

پریم چند کی افسانہ نگاری

اردو کی باقاعدہ افسانہ نگاری کا آگاز پریم چند نے ہی کیا-انھونے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ناول سے کیا اور بعد میں افسانے کی طرف متوجہ ہوئے- پریم چند نے افسانے کی بنیاد حقیقت پسندی پر رکھی ان کا پہلا افسانہ انمول رتن 1909 میں لکھا گیا- اس سال ان کے پانچ افسانہ،'سوزوطن' کے نام سے شائع ہوا-اس میں انہونے قوم پرستی اور حب الوطنی کے جزبات کا اظہار کیا-ان کے افسانہ نگاری کا دوسرا دور 'سوزوطن کے بعد شروع ہوتا ہے ۔ اب انھوں نے نواب رائے کے بجائے پریم چند کے نام سے لکھنا شروع کیا اس دور کی نہایت کامیاب کہانی بڑے گھر کی بیٹی'' ۱۹۱۰ میں لکھی گئی اس کہانی سے انھوں نے افسانہ نگاری کی باضابطہ داغ بیل ڈالی۔ ۱۹۱۵ میں ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ '' پریم پچیسی شائع ہوا ۱۹۱۸ میں پریم بھی حصہ دوم شائع ہوا۔ ۱۹۲۰ میں پریم بتیسی ۱۹۲۸ میں مجموعہ'' خاک پروانہ منظر عام پر آیا۔ ۱۹۳۰ میں پریم چالیسی ۱۹۳۴ میں آخری تحفہ اور ۱۹۳۶ میں زادراہ شائع ہوا۔ اس طرح انھوں نے ۲۸۰ کہانیاں لکھیں آخری دور کی نہایت مشہور کہانی کفن ہے جو ۱۹۳۵ میں لکھی گئی۔ یہ کہانی پریم چند کی کامیاب ترین کہانی ہے ۔

پریم چند شیکسپیر کی طرح فطرت انسان کے کامیاب نباض ہیں ۔ دکھتی رگوں پر انگلی رکھ دینا ۔ دلوں کی کسک اور اضطراب تیرے چہرے بھانپ لینا۔ ان کے لئے ایک عام بات ہے بچپن سے لے کر شباب اور شباب سے لے کر بڑھاپے تک انسان پر طاری

ہونے والی ساری کیفیات ہر طرح کے جذبات گونا گوں واردات خوشی غم محبت _ غریبی امیری غلامی حاکمیت اقتدار مجبوری غرض سو سایٹی کا کون سا گوشہ اور انسانی قلب کی تہہ ہے جس میں جا کر وہ جھانک کر نہ آتے ہیں ا سی جستجو اور بصیرت نے انھیں

درجہ کمال عطا کیا ہے وہ انسانوں کے پلاٹ ہندوستانی معاشرے کے گونا گوں پہلوؤں سے اخذ کرتے ہیں انھوں نے ہندوستان کے دیہاتوں میں

رہنے والے کسانوں کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ اور ہر گوشے کی تصویر کھنچتے ہیں۔ انھیں ہندوستانی لوگوں سے غیر معمولی ہمدروی ہے۔ اور ذات پات کی تفریق کوناپسند کرتے ہیں کچھ متوسط طبقہ کے مسائل پر ان کے خاص نگاہ ہے۔ پروفیسر احتشام حسین لکھتے

"یہ پریم چند کاکام تھا کہ انھوں نے محنت کش عوام کی اپنے افسانوی اور ناولوں کے پیرو بنایا۔ اور اس دنیا کی تصور کی جو سب سے زیادہ جاندار سب سے زیادہ حقیقی اور سب سے زیادہ انسانیت اور دوستی کی مظہرتھی ۔ وہ پہلے ادیب ہیں ۔ جنھوں نے شعوری طور پر ادب کے زریعے عوام کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش مین انسانی دوستی کی طرف قدم اٹھایا

یم چند نے اپنے افسانوں میں دیہات کی خوبصورت تصویرکشی کی ہے وہ گاؤں میں پلے بڑھے تھے۔ اور ہندوستانی گاؤں ان کے روم روم میں بسا تھا۔ انھوں نے گاؤں دیہات کی اصلیت کو جوں کا توں افسانوں میں دکھایا۔

ڈاکٹرقمر رئیس لکھتے ہیں ۔" سرسید حالی شبلی کے بعد اگر کسی ادیب کا طرز تحریر اس کی شخصیت کی بھر پور نمائندگی کرتا ہے تو وہ پریم چند ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے کرداروں کو ماحول کے حساب سے بہت سنوار کر پیش کرتے ہیں ۔ انھوں نے افسانوں میں عام انسانوں کو چنا۔ بقول ایک نقاد اپنے کرداروں کو شہزادوں سے بڑھ کر جشن اور پرستان کی پریوں سے زیادہ دل نوازی بخشی ۔ان کے موضوعات سے زیادہ ان کافن اہم ہے انجمن ترقی پسند کے جلسے میں انھوں نے کہا تھا کہ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو۔ آزادی کا جذ بہ ہو حسن کا جوہر ہوا، تعمیر کی روح ہو، جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور روشنی پیدا کرے ۔ان کے افسانوی مجموعے اس طرح ہیں سوزوطن ، پریم پچیسی ،پریم بتیسی ، خاک پروانہ، پریم چالیسی ، آخری تحفہ، زادراہ، دودھ کی قیمت ، واردات، نمک کا داروغہ، برے گھر کی بیٹی وغیرہ افسانے کردار نگاروں کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کی قائم کردہ روایت کی مدتوں تک افسانہ نگارو نے

پیروی کی۔

احمد ندیم قاسمی

20نومبر16 19 کو ظلع شاہ پور پنجاب کے ایک گاؤں انگہ میں پیدا ہوئے جس گھر میں ٠ احمد ندیم قاسمی پیدا ہوئے یہ کبھی دینوی حشمت کی وجہ سے بہت مم‌تاز تھا مگر ان کی ولادت کے زمانے میں وہ حشمت ختم ہو چکی تھی ۔ اور بقول خود'' جب میں نے آنکھ کھولی تو میرا گھر افلاس بدحالی کا عجیب مرقع تھا – " ابتدائ تعلیم گاوں میں ہوئ 1923ء میں والد کے انتقال کے بعد تعلیم وتربیت ان کے چچانے کی۔ چچابلوجود سرکاری ملازمت کے علم و ادب کے دلدده تھے۔ عربی وفارسی سے بڑا شغف تھا۔اردو سے بھی کافی دلچسپی تھی اقبال کے ہم سبق رہ چکے تھے ۔ اس لئے اقبال کی شاعری کا برابری کر دیا کرتے تھے ۔ ان کے کلام سے بڑا انس تھا اور یہیں

ان کے مختلف اضلاع میں ۱۹۳۵ میں بی اے پاس کر کے بڑی سے بڑی چھوٹی سے چھوٹی نوکری کی تلاش میں سر گرداں رہے ۔ کبھی بیس روپیے کی ملازمت کی کبھی چالیس کی غرض کہ زندگی بدحالی میں گزری۔پنجاب کے مختلف اظلاع میں کسبِ معاش کے لئے دوڑ تے رہے۔ 1939 میں ملتان کے محکمہ آب کاری میں کام کر نا شروع کر دیا لیکن تین سال بعدف ملازمت سے دست بردار ہو گے۔احمد ندیم کی ادبی زندگی کا نیا دور تھا۔ کے ایڈیٹر ہو گئے ۔ ایک سال بعد ادب لطیف کے مدیر ہوگئے ۔ ۱۹۴۶ء میں اس سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔ اس وقت احمد ندیم قاسمی ادبی و علمی مشاغل کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ علاوہ اور کاموں کے آب گل پاکستان ترقی پسند انجمن مصنفین کے سکریٹری بھی رہے۔احمد ندیم قاسمی کلام کی بدولت اردو ادب میں نمایاںحیثیت حاصل کر چکے ہیں ان کا مجموعہ کلام جلال و حجال شائع ہو چکا ہے۔ جس کے دیکھنے سے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا۔ کلام میں جو ذ ہن کو اپنی

طرف متوجہ کرتی ہے وہ تنوع ہے ۔ مضامین میں بھی تنوع ہے ۔ یہ خوبی صرف ایک ذہین اور زمانہ شناس فن کار ہی کے یہاں پیدا ہوسکتی ہے ورنہ تقلید سے شاعر کو بچنا

مشکل ہو جاتا ہے۔ ندیم کے طرز بیاں میں بھی ایک خاص ندرت ہے۔ لب ولہجہ میں ایک ایسا تیکھا پن ہے جو سارے کلام میں تازگی پیدا کرتا ہے ۔ زبان نکسالی و با محاورہ کم ہے فارسی و عربی کی تراکیب سے عموماً کام لیتے ہیں ۔ لیکن روانی میں فرق نہیں آتا۔ ان کا انداز تخاطب نہایت دلکش اور پر تاثیر ہے ۔ ورنہ غالبا یہ ہے کہ وہ جب کسی بات کو محسوس کرتے میں تو شدت کے ساتھ اس کا اثر لیتے ہیں اور ا حساس صداقت بے باکی اور برجستگی کے علاوہ کلام میں خلوص اور جوش ابھا ردیتا

ہے۔ چونکہ ندیم کا مطالعہ بھی وسیع ہے اور زندگی اب تک دکھ اور درد کا شکار ہوتی چلی آئی ہے اس لئے موضوع یا خیال میں نہ تو تکرارہے اور نہ تازگی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ شاعروں کو ہمیشہ بے اثری اور واعظانہ انداز سے بچاتے ہیں ۔ کلام میں درد کیک پیدا کرنے کی کوشش ہر جگہ نمایاں ہے ۔اس لئے ان کے کلام میں للکار اور خطیبانہ خروشی بہت کم ہے عموما وہ دقیق انتظری سے کام لے کر اپنی شاعری میں مظلمت و معنویت پیدا کرنے کی فکر کرتے ہیں ۔ تشبیہ استعارے بڑے حسین نظم کرتے ہیں ۔ منظر نگاری کلب میں ان کا قلم دو پر کاری نہیں پیدا کر سکا جو جوش یا سردار علی جعفری کو حاصل ہے ۔ البتہ متانت و سنجیدگی سے کلام مالا مال نظر آتا ہے۔

منفر دلب ولہجہ کا شاعر مدحت الاختر

(شاہد کبیر)

چھٹی دہائی کے ابتدائی چند سال شعر وادب میں انتہائی اہمیت کے حامل ہیں ۔ ان دنوں جہاں ایک پرانی تحر یک دم توڑ رہی تھی ۔ وہیں ایک نیا ادبی رجحان جنم لے رہا تھا۔ یہ رجحان کسی با قاعدہ ادبی تحریک کا نتیجہ نہیں تھا۔ چنانچہ اختلافی مسائل کا شکار بھی رہا۔ جد یدشعری ادب میں خصوصاً غزل جہاں تیزی سے مقبولیت کے مراحل طے کر رہی تھی وہیں غیر مساعد حالات سے بھی گزررہی تھی ۔ جدید غزل پر جہاں اپنے عہد سے

بے خبری کا الزام تھا۔ وہیں اس کے لب و لہجہ کولسانی شکست و ریخت کا نام دیا جارہا تھا۔ ب کہ حقیقت دیتی کہ نیا اسلوب گل وبلبل اور صیاد و باغباں کی گرفت سے آزاد ہو کر اردو غزل کو ایسی لفظیات اور علامات سے روشناس کردار کا تھا جوزندگی کے قریب اور زیادہ معنی خیز تھیں۔ مگر یہ نمایاں فرق پچھلی صدی کے ماحول سے جڑے ہوئے بزرگوں کو نظر

نہیں آرہا تھا۔ ان موافق حالات ہی جدید لب ولہجہ کی توانائی سے متاثر ہونے والی نئی نسل کے جو شعراء تنقید اور الزامات سے بے نیاز ہوکر اعتماد اور لگن کے ساتھ جدید غزل کی آرائش میں مصروف تھے ان میں ایک نام مدحت الاختر بھی تھا۔ اگر جدید شاعری پر عصری نام کی اور اپنے معاشر کے لیے بے کافی کا الزام ہے تو مدحت جدید سام شاعر ہیں تو جدید غزل پر عصری نا آگہی اور اپنے معاشر۔ کی سے زیادہ مضحکہ خیز کوئی الزام ہی نہیں بولتا۔ میں روز وشب کا شاعر نہ صرف اپنے معاشرے سے پوری طر ہے بلکہ اپنے گردوپیش کے ماحول پر بھی تیز سدحت الاختر کا المیہ ان کی اپنی بصیرت کا زخم ہے ۔ خلوتیں بیچ کے محفل کو خریدا جا ئے اب تو آنکھوں سے میداند حیرانہ دیکھا جا۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ کیا ذیل کے اشعار اپنے اردگرد کے حالات سے بے خبری کا نتیجہ ہیں۔

مجھ کو برابتا کے و ہاچھا تو بن گیا اچھا ہوا چلو کوئی بگڑ اتو بن گیا

جھلکتا ہے تری ہر بات سے سچ ترا لہجہ ابھی کچا بہت ہے

مدحت الاختر جس جسارت اور صاف گوئی سے معاشرے کے کمزور پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ ان مخصوص اور منفر دلب ولہجہ ہے مگر اس سے جا کر ان کے اظہار خیال کا وہ جرات مندانہ انداز ہے جس میں وہ اپنی ذات کے حوالے سے قارئین کو زندگی کی تلخیوں سے روشناس کرواتے ہیں۔

روتے ہیں مگر آنکھ سے آنسو نہیں بہتے

ہم سا کوئ دنیا میں ریا کار نہیں ہے

مدحت الاختر کے بیشتر اشعار کی گہری سوچ اور فکر کے حامل ہوتے ہیں ان اشعار میں معافی کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں

اور قاری فراگیری میں ڈوب جاتا ہے۔

کاغذ پر ایک درخت کی تصویر اور بحث کس جا کھلینگےپھول کہاں پھل اگا ئیں گے۔

اسی خیال میں صدیاں گزاردی ہم نے جو آج نہ ہواخیریت سے کل ہوگا

وہگو جدید شعرا ء کی طرح مدحت نے بھی اساطیری ادب اور طلسمی داستانوں کی اصطلاحوں سے استعفادہ کیا ہے اور یہاں بھی اپنے منفرد اور معصومانہ انداز کو برقرار رکھا ہے صرف دو شعر

کب اپنے کئے گا مجھے اقرار نہیں ہے

وہ سنگ اٹھاے جو گنہ گار نہیں ہے

مین ہوں دیوار پہ لکھا ہوا کب سے لیکن

کوئ پڑھتا نہیں رستے سے گزرنے والا

یہی نہیں بلکہ جہاں انھوں نے شدیدغم و غصے کا اظہار کیا ہے وہاں بھی انفرادیت کی فضا کو قائم رکھا ہے جسے بخوبی سمجھنے کے

لئے ایک ہی ہجو کے چند اشعار ہ

خدا کے نام پہ جھوٹے حلف اٹھا تا ہے

کیئے ہیں اس نے اسی تیر سے شکار بہت

محمد داؤد خان اختر شیرانی

محمد اختر شیرانی کا پورا نام محمد داؤد خان اختر شیرانی ہے-

ان کے والد حافظ محمود شیرانی اپنے وقت کے بلند پایہ محقق تھے ۔ اختر شیرانی کی پیدائشراجستھان کے شہر ٹونک میں ہوئی اس کے بعد ان کی پرورش پاکستان کے شہر لاہور میں ہوئ-صابر علی خاں سے اصلاح لی اور جلد ہی اصلاح سے بے نیاز ہو گے ۔

شعری خصوصیات:

وہ شاعری میں سنجیدہ فکر ، فلسفیانہ فکر
رکھتے ہین وہ صرف رومانی شاعر ہیں ان کینظموں میں ہر جگہ کوئ نہ کوئ حسین جلوہ گر نظر آتا ہے- ایک نقاد کے کہنے کے مطابق ان کی شاعری فلسفہ و تصوف کے بجاے عشق مجازی کے لطیف جزبات اور وجدانگیر عنایت سے معمور ہے-

اختر کی نظموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر کی محبت افلاطونی انداز کی ہے گوشت پوشت کا ایک مادری پیکر رکھنے کے باوجود عورت کا سراپا تخلیقی ہی نظر آتا ہے وہ اختر کی شاعری میں اپنے وجود سے بلند ہو کر ما بعد الطبیعات حیثیت اختیار کر لیتی ہے-

---